

علی(ع) اور عرفان حقیقی

<?xml encoding="UTF-8">

ان کنتم تحبون اللہ فا تبعونہ

(اگر خدا سے محبت کر تے ہو تو میری پیروی کرو)

علی(ع) کا تعلیم کردہ عرفان حقیقی :

پروردگار! اے ہر محبوب سے زیادہ محبوب تر! اے ہر نزدیک سے زیادہ نزدیک تر! اے بھر وسہ کرنے والوں کی ڈھارس! تو ان کو اندھیروں میں بھی دیکھ لیتا ہے، تو ان کے دلوں کے حالات سے واقف ہے، تو انکی وسعت بینائی کو جانتا ہے، انکا ہر راز تیرے سامنے بے پردہ ہے اور انکا دل تیرے دیدار کا مشتاق ہے۔ اگر تنہا ٹیوں کا اندھیرا انہیں وحشت زدہ کرتا ہے تو وہ تیری یاد کی شمعیں روشن کر کے اپنے دل کو سکون پہنچا لیتے ہیں۔ اگر تکلیف و پریشا نیان پر حملہ کرتی ہیں تو وہ تیری پناہ لے لیتے ہیں چونکہ جانتے ہیں کہ ہر کام تیری قدرت سے ہوتا ہے اور ہر کام تیرے ازلی قوائین سے وابستہ ہے۔

علی بن ابی طالب(ع)

ہر وہ شخص جس نے قرآن کے نقطہ نظر یا احادیث کی روشنی سے اصول و فروع اسلام کا بغیر جانبداری کیسا تمام مطالعہ کیا ہے، بلا تامل تصدیق کر سکتا ہے کہ اسلام نے انسان کیلئے نہ فقط معرفت و شناخت کے تمام راستے بیان کر دیے ہیں بلکہ اسلامی نقطہ نظر سے تخلیق ہستی و کائنات کی اصل علت و غرض ہی معرفت و کمال ہے۔ اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ راہ تکامل و معرفت کے حوالے سے اسلام میں ناقص پایا جاتا ہے تو یقیناً ایسا شخص یا تو اسلامی تعلیمات سے بے خبر ہے یا کسی ذاتی خود غرضی کی بنا پر ایسا کہہ رہا ہے۔ اسلام ایک ایسی حقیقت ہے جسمیں ذرہ برابر بھی نقص کا شائبہ نہیں پایا جاتا ہے اور یہ دعویٰ بھی ایک ایسا دعویٰ ہے کہ اسلام کے رہنماؤں نے نہ فقط اس صدی یا کسی مخصوص زمانے میں بلکہ صدیوں سے لیکر اب تک ہمیشہ دنیا والوں کے گوش گزار کیا ہے۔ ایسی کونسی جاودانی و آفاقی حقیقت ہے کہ بشر نے اپنے ضعیف یا قوی افکار میں اسکی پرورش کی ہو اور اسلام نے اسکی طرف اشارہ نہ کیا ہو؟ فلسفہ، سائنس، اخلاق، سماجیات، معاشیات، قیامت وغیرہ کے بارے میں جسقدر ممکن تھا اور واقعیت سے مطابقت رکھتا تھا، اسلام نے بیان کر دیا ہے خواہ بطور کلی۔ اگر خدا شناسی کی گفتگو کی ہے تو عقل و قلب کی بلند ترین راہوں کے ذریعے شناخت کرائی ہے، فلسفہ کے متعلق انسانی عقل کو پیش نظر رکھتے ہوئے جامع

ترین نکات بیان کئے ہیں ، اخلاقیات کے موضوع پر بحث کی ہے تو مختصر اور جاذب کلمات قصار کی صورت میں اخلاقی نکات بشر کے حوالے کئے ہیں ، علم کے دروازے نہ فقط ہر شخص کے لئے کھلے چھوڑ دئے ہیں بلکہ کائنات کے ظواہر و حقائق کے بارے میں جستجو کو جزاء ایمان قرار دیا ہے ، معاشرے کے ہمیشہ زندہ رہنے والے اصول کو اس طرح بیان کیا ہے کہ کسی مکتب فکر یا گروہ نے اس طرح بیان نہیں کیا تھا ، نہ ماقبل اسلام اور نہ مابعد اسلام ۔ ساتھ ہی رہتی دنیا تک اس سلسلے میں اس سے بالاتر اور بہتر طور پر ایک حرف کا اضافہ تک نہیں کیا جاسکے گا ۔

اقتصادی اصولوں کی اس حد تک تشریح و وضاحت کی ہے کہ کوئی اقتصاد دی مکتب اسکی دقت سنجیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا درحالیکہ اگر کوئی مکتب فکر معاشرے کے کسی ایک پہلو کو رفو کرتا ہے تو دوسرا پہلو ہزار جگہ سے پارہ پارہ ہو جاتا ہے ۔

اسلام نے قیامت کا منظر اس طرح سے کھینچا ہے کہ انسان ، دنیوی زندگی میں مشغول و متوجہ ہونے کے باوجود قیامت کا مجسم تصور کر لیتا ہے ۔

اس بات کی ضرورت بھی نہیں ہے کہ مشرق و مغرب سے استشہا دلائے جائیں اور ثابت کیا جائے کہ بلند و بالا افکار کے ذریعہ حاصل شدہ انسان و کائنات کی حقیقی معرفت کا منبع اسلام ہے کیونکہ یہ بات خود ہی اظہار من الشمس ہے ۔ اسلام نے ماقبل اسلام ، کتب آسمانی اور بشری عقل سالم کے ذریعے حاصل ہونے والے آفاقی حقائق کی تصدیق کی ہے لیکن اسلام کے ظہور کے بعد خدا شناسی ، طبیعت شناسی اور انسان شناسی کے متعلق بیان کی جانے والی ہر قسم کی حقیقت ، خواہ منظوم یا منثور ، کا سرچشمہ فقط و فقط اسلام ہی کو سمجھا جاسکتا ہے ۔

مثلاً سعدی شیرازی کے عالی مضامین کو سنکر ہر شخص اپنا سر دھنتا ہے جبکہ سعدی کی عام غزلیات اور داستانوں کو اگر مستثنیٰ کر دیا جائے تو خود بخود واضح ہوتا ہے کہ سعدی نے اپنے مضامین عالیہ کی ترتیب و تنظیم میں یا تو براہ راست قرآن یا روایات سے استفادہ کیا ہے یا ان شعراء و حکماء سے استفادہ کیا ہے جنہوں نے اپنے مضامین و مطالب اسلام سے اخذ کئے ہیں مثلاً متنبی ، سید رضی ، مہیا دیلمی وغیرہ ۔ علاوہ ازیں ، مثلاً انسان کی معنوی اور وحی آزا دی وثبات کے سلسلے میں کہے جانے والے اشعار میں بہترین شعر طغرائی کا مندرجہ ذیل شعر ہے:

انما رجل الدنيا وواحدھا

من لا يقول في الدنيا على رجل

(جو کسی کی پناہ نہ لے ، تنہا مرد میدان ہے)

غلام ہمت آتم کہ زیر چرخ کبود

زہر چہ رنگ تعلق پذیرد آزاد ست

ان دونوں اشعار کا مضمون سینکڑوں مرتبہ قرآن اور روایات میں ان مقامات پر بیان ہوا ہے جہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ انسان کا ملجا و ماویٰ فقط خداوند عالم ہے البتہ ہمارے بزرگوار رہبروں کا ہمیشہ یہ نقص رہا ہے کہ جب وہ ان مضامین و مطالب کو بیان کیا کرتے تھے ، خواہ نثر میں خواہ نظم میں ، تو کبھی یہ نہیں کہتے تھے کہ یہ مضمون فلاں آیت یا روایت سے ماخوذ ہے ۔ ظاہر ہے کہ ہمارا معاشرہ بھی عام طور پر عربی

زبان سے آشنا نہیں تھا اور فقط کسی حد تک قرآن و روایات سے آشنائی رکھتا تھا، وہ بھی اس وجہ سے کہ مجا لس وغیرہ میں خال خال ان کا تذکرہ ہو تارہتا تھا۔ اس کے علاوہ معاشرے کو اسلام میں پائے جانے والے عالی مضامین و مطالب کی نہ شناخت تھی اور نہ پہچان۔ اسی وجہ سے ہمارے شعر اودبا کی زبان سے جاری ہو نے والے ہر کلام و مضمون کے بارے میں یہی نظر یہ قائم کیا جاتا تھا کہ یہ ان کی اپنی ذہنی جدت و تخلیق ہے، لہذا ہمارا معاشرہ قرآن و روایات کے مقابلے میں ان اشعار سے زیادہ مانوس ہو گیا جبکہ اگر گزشتہ حضرات ان مضامین عالیہ کے منافع و مآخذ کا تذکرہ بھی کر دیا کرتے تو نہ فقط ان کی شان میں کوئی کمی نہ آتی بلکہ ان کے کلام کو الہی تاثیر بھی حاصل ہو جاتی۔ اسی سہو یا غلطی کی بنا پر اسلام کو دوطرح کا ضرور نقصان برداشت کرنا پڑا ہے؛ ایک تو یہ کہ معاشرہ قرآن و روایات سے دور ہو گیا اور یہ گمان کر لیا گیا کہ شعر و حکما کا سارا کلام الہامی ہو تا ہے۔

دوسرے یہ کہ ان مضامین کے جاذب ہونے کی وجہ سے بے سرو پا مضامین بھی ان کے ساتھ ہی ساتھ معاشرے میں راسخ ہو گئے ہیں۔ انسان اگر ایک مضمون کو بیان کرتے وقت اسکا مآخذ، قرآن و روایات کو قرار دے، درحالیکہ وہ مضمون ازاول، قرآن و روایات میں موجود تھا تو یہ بذات خود بزرگی روح اور عرفان سے ارتباط کی ایک علامت ہے۔

مختصر یہ کہ اسلام نے ہر اس حقیقت کو بیان کر دیا ہے جو کسی نہ کسی صورت میں کمال و تکامل انسانی میں معاون ثابت ہوسکتی ہے۔ اس مقام پر کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے شعر و حکما نے ایک یہ بھی اچھا کام کیا ہے کہ ان عرفانی حقائق کو مختلف جاذب، پرکشش اور فنی اصطلاحات کا لباس پہنا دیا ہے یا اس طرح منظوم کر دیا ہے کہ ایک عام انسان کے احساسات تیزی کے ساتھ حرکت میں آجاتے ہیں۔

عرفان حقیقی ایک ایسا مکتب ہے کہ رسول گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد علی(ع) اور آپ کی اولاد نے اس پر بطور مطلق حکومت کی ہے۔

اس بحث کا عنوان عرفان حقیقی اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ نفس انسانی، معرفت خداوندی کے تمام مبادیات و علل اور روح کے بلند او صاف کی شناخت اور اس کے مطابق روش، اسی طرح تمام دوسرے حقائق اور حوا دث ہستی و کائنات کی شناخت کو نہ فقط تجویز کرتا ہے بلکہ ضروری و لازم بھی سمجھتا ہے۔

اس عرفان حقیقی سے روح کا مثبت پہلو مراد ہے یعنی عقل و اشراق قلبی کی بنا پر جو حقائق روح پر نازل ہوتے ہیں، کسی نہ کسی صورت میں اثر انداز بھی ہوتے ہیں اور اس طرح ہر وہ حقیقت یا واقعہ جو روح کے اس مثبت دائرے سے باہر ہے اسکو عرفان حقیقی میں خیال، توہم اور تجسیم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عرفان حقیقی کے اعتبار سے عظمت خداوندی اور طبیعت (nature) قطعاً ہم سنخ نہیں ہیں، عرفان حقیقی ان تمام او صاف عالیہ و کمالات کو انسان کے لئے ضروری سمجھتا ہے کہ جنکو منادیاں تو حید نے ہم تک پہنچا یا ہے، مثبت عرفان قرب خدا کیلئے انبیاء کرام کے ذریعے بیان کردہ دستور ات کو ضروری گردانتا ہے، عرفان حقیقی تمام انسانوں کو تمام کمالات روحی و مقامات معنوی حاصل کرنے کے قابل سمجھتا ہے، عرفان حقیقی میں مبداء اعلیٰ کی طرف توجہ کے وقت ہر قسم کا واسطہ جو تجسیم قلبی کی صورت میں ہو، شرک ہے خواہ یہ مجسم شدہ واسطہ پیامبر اکرم(ص) کی صورت میں ہی کیوں نہ ہو۔

عرفان حقیقی کا اولین و آخرین کامل نمونہ، اپنے دست مبارک سے زراعت کرنے والے، شب کی تاریکی و تنہائی میں اپنے محاسبہ نفس کے بعد بارگاہ خداوند عالم میں حاضر ہونے والے، اشتیاق دیدار و خوف و پریشانی فراق معشوق میں بے خود ہو نیوالے علی بن ابی طالب(ع) ہیں۔ عرفان حقیقی اس کے علاوہ اور کچھ

نہیں ہے جس کو ر ہبر ان ما وراء الطبيعة نے بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ فقط و فقط خیا لات و تخیلات کے ذریعے تسکین روح کا باعث اور عمر گزارنے کیلئے ہی قابل قبول ہوسکتا ہے اور بس۔ علی(ع) کی زندگی ہمارے لئے عرفان کی حقیقت کو واضح طور پر بیان کرتی ہے۔ علی(ع) کے عرفان میں خدا ستائی کے عنوان سے خود ستائی عین شرک ہے۔

ایک مشہور داستان ہے کہ امیر المومنین(ع) نے باغ بفیغہ کے پانچ وسق (تقریباً 847/ کلو گرام) خرما کے ایک شخص کے پاس ارسال کئے۔ اس وقت ایک دوسرا شخص بھی امام(ع) کے نزدیک موجود تھا۔ اس نے امام سے کہا کہ اے علی(ع)! اس شخص نے آپ سے سوال نہیں کیا تھا پھر بھی آپ یہ خرما کیوں ارسال کر رہے ہیں۔ امیر المومنین(ع) نے فرمایا: ”خدا تجھ جیسے افراد کو مومنین کے درمیان زیادہ نہ کرے۔ میں دے رہا ہوں اور تو کنجوسی اور بخل کر رہا ہے۔ اگر ان خرموں کو اس کے دست سوال دراز کرنے کے بعد دیتا تو اس وقت اپنی اس عطا کی قیمت (اس کے سوال کی صورت میں) مجھے مل چکی ہوتی کیونکہ دست سوال دراز کرنے کے بعد وہ شخص مجبوراً اپنی آبرو و عزت دیکر خرما میں حاصل کرتا۔

یہ وہی عرفان حقیقی ہے کہ جو اولاد آدم کو فرد و معاشرے سے متعلق ذمہ داریوں اور وظائف کا احساس دلاتا ہے۔ یہ وہی عرفان حقیقی ہے کہ اگر بشریت؛ فرد، معاشرے اور حکومت کے درمیان ہر انسانی جہت سے ممکنہ روابط کی اصلاح کیلئے غور و فکر کرے تو خود بخود مجبور ہو جائیگی کہ اس عرفان کو اپنا سرنامہ عمل قرار دے۔

یہ وہی عرفان حقیقی ہے کہ ہمارے الہی رہنماؤں نے جسکی طرف ساری دنیا کو دعوت دی ہے۔ یہ عرفان اسلامی شریعت کے وہ دروس ہیں جنہیں قرآن مجید ہر صبح و شام دنیا والوں کیلئے بیان کرتا رہتا ہے: ”قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی“ (اے رسول کہہ دو! اگر خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو)۔ اس عرفان میں معاشرے کے افراد ایک دوسرے کے عضو کی مانند ہیں یعنی ان اعضاء میں سے ہر عضو کو دوسرے عضو کے آرام و سکون کی خاطر حتیٰ الامکان سعی و کوشش کرنا چاہیے۔ اگر کسی عضو کی تکلیف و درد کا علاج رات میں کیا جاسکتا ہو لیکن اسکو اگلی صبح پر موقوف کر دیا جائے تو ایسی صورت میں عرفان، عرفان حقیقی نہیں ہے اور ایسا عمل انجام دینے والا شخص بھی عارف نہیں۔

عرفان حقیقی روزمرہ زندگی کے امور کی تنظیم و ترتیب کو نہایت اہمیت دیتا ہے: ”من کان فی هذه اعمی فهو فی الآخرة اعمی“ یعنی جو شخص اس دنیا میں نابینا ہے وہ آخرت میں بھی نابینا رہے گا۔ اس کے علاوہ ”من لا معاش لہ لا معاد لہ“ یعنی جس شخص کی زندگی مرتب نہ ہو، اس کیلئے قیامت بھی نہیں ہے۔

اسی حوالے سے امام(ع) فرماتے ہیں: ”اللہ اللہ فی اصلاح ذات البین و نظم امر کم“ یعنی اے میرے بیٹو! خدا سے ڈرو اور اپنے امور کو مرتب و منظم رکھو۔ عرفان حقیقی میں کائنات سے متعلق غور و فکر اشد ضروری ہے: ”ان فی اختلاف الليل والنهار لآیات لا ولی الا لباب الذین یذکرون اللہ قیاماً و قعوداً و علی جنوبہم ویتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ما خلقت هذا باطلاً سبحانک فقنا عذاب النار“ (بیشک لیل و نہار کی آمد و رفت میں صاحبان عقل کیلئے قدرت خدا کی نشانیاں ہیں۔ جو لوگ اٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی خلقت میں غور و فکر کرتے ہیں کہ خدا یا تو نے یہ سب بیکار نہیں پیدا کیا ہے۔ تو پاک و بے نیاز ہے ہمیں جہنم سے محفوظ فرما!)

لہذا عرفان حقیقی ایک ایسی حالت نہیں ہے کہ بعض مواقع پر کچھ لمحوں کیلئے حاصل ہو جائے اور بقیہ

عمر ہو ئی وہو س کی پیر وی کر تے ہو ئے گز اردی جا ئے کہ جسمیں نہ ایسی زندگی کی خبر ہے جو قرب الہی کا وسیلہ ہو اور نہ ذمہ داریوں اور وظائف کا احساس بلکہ عرفان حقیقی قطعاً اس کے برعکس ہے۔ عرفان حقیقی میں انسان کا مرتبہ، اشرف المخلوقات تک پہنچ جاتا ہے یعنی انسان ایک ایسا موجود ہے جس کے مد نظر ہمیشہ اور ہر مقام پر زندگی کا عالی ترین ہدف رہتا ہے۔ اس کیلئے مادی اور ظاہری دنیا قرب الہی کی راہوں کو مسدود نہیں کرتی ہے، روح کی عظمت و برتری کے مقابل موجودات کے ظاہری اجسام کی کوئی حیثیت نہیں ہے البتہ اتنا ضرور ہے کہ یہی اجسام، باطن کے تصفیے، خود سازی اور روح کی عظمت کو فعلیت کی حد تک پہنچانے کا بہترین وسیلہ ہیں، لہذا عرفان حقیقی میں کائنات کے متعلق غور و فکر اور اس کے حقائق و موجودات سے حتی الامکان استفادے کو تکامل انسانی کے لئے اصل و اساس قرار دیا گیا ہے۔

عرفان حقیقی میں محبت سے مراد وہ عبادت ہے کہ جس کیلئے خود خدا (معشوق) کی طرف سے حکم جاری ہو اہے تاکہ روح، علائق دنیوی سے خود کو آزاد کر سکے کیونکہ اس عرفان میں محبت و عشق براہ راست فقط خدا ہی سے کیا جاسکتا ہے۔ ہاں، دوسرے مایلات و علائق بھی اگر فرمان خدا وندی کی پیروی کے عنوان سے انجام دئے جائیں تو انکا شمار بھی درحقیقت عشق خدا میں ہی کیا جائیگا۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص سے محبت یا دوستی کرتا ہے تو جب بھی اسے کوئی ناگوار حادثہ پیش آتا ہے، پہلا شخص دوسرے کو صبر کی تلقین کرتا ہے، تعزیت پیش کرتا ہے تاکہ اسکو تسکین قلب حاصل ہو سکے، اگر وہ مریض ہو جاتا ہے تو اسکی عیادت کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام موارد حقیقتاً محبت خدا ہی سے سرچشمہ حاصل کرتے ہیں کیونکہ روز قیامت خداوند عالم سوال کریگا کہ میں مریض تھا تو نے میری عیادت کیو نہیں کی؟ بندہ سوال کریگا کہ خداوند آخر تو کیسے بیمار ہوتا ہے؟ خدا فرمائیگا کہ میرا ایک بندہ مریض تھا تو اس کی عیادت کے لئے نہیں گیا۔ اسی طرح کے واقعات انبیائے کرام اور خاندان عصمت میں اس کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ شمار ہی نہیں کیا جاسکتا۔ روز روشن کی طرح واضح ہے کہ خداوند عالم کو قرص کی قطعاً کوئی حاجت نہیں ہے لیکن قرآن کریم فرماتا ہے: ”من ذالذی یقرض اللہ قرضاً حسناً“ (کون ہے جو خدا کو قرص حسنہ دے؟)

لہذا معاشرے میں پائے جانے والے اس طرح کے جائز ارتباطات و تعلقات عین محبت خدا ہیں اور کیونکہ عین محبت خدا ہیں لہذا عرفان حقیقی کے اصول مسلمہ میں سے بھی ہیں۔

حقیقی عرفان اپنے خدا کے ساتھ جس محبت و عشق کا شکار ہوتا ہے وہ قطعی طور پر عشق حقیقی ہے نہ کہ عشق مجازی۔ عشق حقیقی و مجازی کی مزید وضاحت کے لئے ضروری ہے کہ ایک مختصر تمہید بیان کی جائے۔

عرفان اور عشق حقیقی

لفظ ”عرفان“ بھی ان الفاظ میں سے ہے کہ تاریخ علم و فلسفہ ابھی تک جنکے صحیح اور حقیقی معنی پیش نہیں کرسکی ہے یعنی یہ ایک ایسا لفظ ہے کہ ہر شخص نے اس کے لئے اپنے طور پر ایک معنی فرض کر لئے ہیں۔ بہر حال لغوی اعتبار سے لفظ ”عرفان“ بھی ”معرفت“ کی مانند ایک مصدر ہے ”معرفت“ یعنی شناخت لہذا عارف یعنی وہ شخص جو حامل شناخت ہو۔

ادبی اعتبار سے عارف اور عالم کے درمیان دو طرح کا فرق پایا جاتا ہے :

(1)۔ عارف صرف اس شخص کو کہہ سکتے ہیں جو کسی چیز کے بارے میں پہلے سے نہ جانتا ہو اور اب وہ چیز اسے معلوم ہو گئی ہو لیکن عالم میں ایسا نہیں ہے بلکہ ممکن ہے کہ آدمی، عالم کہے جانے سے پہلے بھی اس چیز کو جانتا ہو۔ اسی وجہ سے خدا کو عالم کہا جاتا ہے نہ کہ عارف کیونکہ اسکے علم سے پہلے جہل کا تصور نہیں ہے۔

(2)۔ لفظ ”معرفت“ کا استعمال اکثر وبیشتر جزئیات میں کیا جاتا ہے جبکہ ”علم“ جزئیات کے ساتھ ساتھ کلیات میں بھی مستعمل ہے۔

لیکن فلسفہ اور حکمائے متاخرین (بوعلی سینا اور ان کے بعد) کی اصلاح میں ”عرفان“ ایک مخصوص معنی میں مختلف انداز سے استعمال ہوتا رہا ہے۔ عرفان کے لئے استعمال شدہ ان تمام معانی و اصطلاحات کی گنجائش اس مختصر مقالہ میں قطعاً نہیں ہے لہذا یہاں فقط عرفان کے وہی معنی بیان کئے جارہے ہیں جو کسی حد تک آپس میں قدر مشترک رکھتے ہیں اور مشہور ہیں۔

عارف : اس شخص کو کہا جاتا ہے جو تمام علائق سے انقطاع پیدا کر کے عام کتابوں میں نوشتہ شدہ راہ و روش کے ذریعے قرب خدا حاصل کر لیتا ہے اور یہ قرب تدریجاً انسان کو مقام فنا فی اللہ میں تبدیل کر دیتا ہے کہ جسکو اصطلاحاً ”ہو ہو بعینہ“ بھی کہا جاتا ہے۔ عرفان کے مذکورہ معنی مختلف انداز و اطوار سے ارباب عرفان کے درمیان، نظم و نثر دونوں میدانوں میں، قابل قبول اور متفق علیہ رہے ہیں۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس عرفان کے مقدمات محبت سے شروع ہوتے ہیں یا تمام دیگر موجودات کی بے ثباتی اس عرفان کا سرچشمہ ہے یا پھر تجسمات روح یا وہم اسکا باعث بنتے ہیں؟ ان تمام سوالوں کے جوابات تفصیلی طور پر ”عرفان منفی“ میں ہی دئے جا سکتے ہیں۔

عرفان کے ایک دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ عرفان ہر اس شخص کا مخالف ہے کہ جو منکر ہے یعنی عرفان کے اس دائرے میں کسی بھی صورت میں کوئی منکر داخل نہیں ہو سکتا کیونکہ ایسا کون سا شخص ہو گا جو معرفت و شناخت سے دوری اختیار کرنا چاہیگا اور انکار کریگا لیکن عرفان کے اس معنی سے سرسری طور پر نہیں گزرا جاسکتا بلکہ یہ ایسے معنی ہیں کہ جو نہایت احتیاط اور دقت سنجیوں کا مطالبہ کرتے ہیں مبادا خیال و پندار ہائے غلط اور غیر صحیح اپنا سر اٹھا لیں۔ پس لامحالہ عرفان حقیقی ہی ایسا عرفان ہے جو انسان کو کمال و تکامل کی آخری منازل تک لے جا سکتا ہے۔ خود خداوند عالم انسانوں کیلئے عرفان کے معنی کو اس طرح بیان فرما رہا ہے: ”قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی“ (اے پیغمبر! کہدو کہ اگر تم لوگ اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو!)

وجود انسانی میں عشق کو دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے

(1) عشق مجازی: اس عشق کا منبع محبوب کے وہ دلنشین اوصاف ہوتے ہیں جو انسان کے نفس کے ساتھ ہم آہنگ اور اس سے مطابقت رکھتے ہیں یعنی انسان کا نفس ان اوصاف کا گرویدہ ہوتا ہے۔

(2) عشق حقیقی: اس عشق کا منبع محبوب کے وہ کمالات ہوتے ہیں جو انسان کی روح سے مطابقت رکھتے ہیں یعنی روح انسان ان کمالات تک پہنچنا چاہتی ہے جیسے کمال علم، علم و دانش کی محبت کو عشق حقیقی کہیں گے۔ اسکے برخلاف مال و جمال جیسی چیزوں کی محبت کو عشق مجازی کہیں گے۔ عرفان حقیقی میں اساسی کردار، عشق حقیقی کا ہوتا ہے کیونکہ عرفان حقیقی میں محبوب، کامل مطلق خدا ہے کہ جس میں ذرہ برا بر نقص کا شائبہ محال ہے۔ حکماء کی اصلاح میں یہ ایسا کمال مطلق ہے جو فوق

التمام ہے اور ایسا تمام ہے جو فوق الکمال ہے۔ علاوہ از این، عشق مجازی میں محبوب ہمیشہ فنا ہو جانے والا ہوتا ہے جب کہ عشق حقیقی میں محبوب ہمیشہ دائم وقائم اور باقی رہنے والا ہے۔ عشق مجازی میں مبتلا افراد کی نگاہ میں عشق حقیقی کی حیثیت ایک غیر مانوس اور غیر موزوں آہنگ یا نغمے کی سی ہوتی ہے جب کہ ارباب عشق حقیقی کی نظر میں عشق مجازی میں گرفتار شخص اس پرندے کے مانند ہوتا ہے کہ جسکو ایک قفس میں محصور و مقید کر دیا جائے اور ہر لمحے اس پرندے کی خواہش و کوشش یہی رہتی ہے کہ کسی طرح اس قفس سے آزاد ہو جائے درحالیکہ وہ اس بات سے غافل ہوتا ہے کہ قفس میں موجود سوراخ یا شگاف اسکو آزاد نہیں کراسکتے۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ گنہگاروں کے سامنے عشق حقیقی سے متعلق گفتگو کرنا خود اس عشق پر ایک قسم کا ظلم و ستم ہے #

مدح توحیف است بازندانیاں

گویم اندر محفل روحانیاں

(اے عشق حقیقی! حیف ہے کہ میں تیرا قصیدہ گنہگاروں کے درمیان پڑھوں بلکہ اس قصیدے کا مقام تو عشق حقیقی میں ڈوبے ہوئے دل ہیں۔)

عشق مجازی اپنے موضوع کے رفتہ رفتہ متغیر ہونے کی وجہ سے خود بھی متغیر ہوتا رہتا ہے۔ بالفرض اگر اسکو کمال حاصل ہو بھی جائے تو ایک نہ ایک دن اسے اپنے محبوب سے دل برداشتہ ہونا ہی پڑتا ہے جبکہ اس کے برخلاف عشق حقیقی اگر عقل و قلب کو مد نظر رکھتے ہوئے شروع کیا جائے تو ہمیشہ لامتناہی کمال و تکامل کی جانب بڑھتا چلا جاتا ہے۔

یہ ہے عرفان حقیقی میں عشق کا مفہوم و معنی کہ جسکی اولین علامت معشوق ازلی وابدی کی فرمائشات و خواہشات کی انجام آوری ہے یعنی عرفان حقیقی میں ”لا حول ولا قوۃ الا باللہ“ کہا جائے تو دل کی گھرا ئیوں سے کہا جانا چاہئے۔

دل کی گھرائیوں سے نکلنے والا جملہ ”لا حول ولا قوۃ الا باللہ“ انسان کو خدائی اوار و نواہی کا پیر و بنا دیتا ہے اور پھر ایک وقت وہ بھی آتا ہے کہ جب خود عاشق کا وجود اس جملے کی نشاندہی کرنے لگتا ہے یعنی جیسے ہی نماز کیلئے اللہ اکبر کہتا ہے خود کو محراب عبادت میں اپنے ہی خون میں نہلا نے تک کیلئے آمادہ ورتیار کر لیتا ہے۔

عرفان حقیقی میں جملہ ”لا حول ولا قوۃ الا باللہ“ عارف کے مقدس دامن کو کلمہ ”میں“ سے مکمل طور پر پاک کردیتا ہے۔ ایک عارف کیلئے ”میبایسا کرتا ہوں“ یا ”میں نے یہ کیا“ جیسے جملے لا یعنی اور لغو ہو کر رہ جاتے ہیں لیکن ان افعال کے ماسوا جواختیاری اور اسلامی احکامات کا محور ہیں کیونکہ عارف جانتا ہے کہ

برباد فنا تا ندھی گرد خودی را

هرگز نتوان دید جمال احدی را

(یعنی جب تک اپنی خودی اور انانیت کو خود سے دور نہیں کر لو گے اس وقت تک خدا ئے وحدہ لا شریک کے جمال کا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔)

عارف مثبت ” اپنی عقل کو زندہ رکھتا ہے اور اپنے نفس کو مردہ بنا دیتا ہے ۔ اسکا جسم باریک ہو جاتا ہے اور اسکا بھاری بھر کم بدن ہلکا ہو جاتا ہے اور جب وہ اس ریاضت کو انجام دے لیتا ہے تو عالی ترین حقائق کا اس طرح احساس کرتا ہے جس طرح ایک باریک بال کا ۔ اس کے دل میں بہترین ضو یا ش نور ہدایت چمک اٹھتا ہے اور اس نور کے ذریعے راہ ہدایت کو حاصل کر لیتا ہے ۔ تمام دروازے اسے سلامتی کے دروازے اور ہمیشگی کے گھر تک پہنچا دیتے ہیں اور اس کے قدم طمانیت بدن کے ساتھ امن و راحت کی منزل میں ثابت ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے دل کو استعمال کرتا ہے اور اپنے رب کو راضی کر لیتا ہے ۔“ (1)

”اے ابوذر ! اب جبکہ ان لوگوں نے اپنی دنیا کی خاطر تم کو معاشرے سے نکال دیا ہے مبادا تم غیر از خدائے ودود ، کسی سے انس پیدا کرو اور غیر از باطل کسی شئی سے خوف کھاؤ۔“ (2)

مناسب ہے کہ اس مبحث کا خاتمہ ان جملوں کو قرار دیا جائے جو عرفان حقیقی کا شاہکار ہیں یعنی وہ عرفانی جملے جو روز عرفہ فرزند امیر لمو منین حسین بن علی علیہما السلام کی زبان مبارک سے جاری ہوئے تھے:

خدایا ! تیرے ماسوا ایسا کون ہے جو تجھے ظاہر کر سکے۔۔۔۔

خدایا! میں اپنی مالداری میں بھی فقیر ہی ہوں تو غربت میں کس طرح فقیر نہ ہوں گا اور اپنے علم کے باوجود جاہل ہوں تو جہالت میں کس طرح جاہل نہ ہوں گا۔ تیری تدبیروں کی نیرنگی اور تیرے مقدرات کی سرعت تبدیلی نے تیرے با معرفت بندوں کو روک رکھا ہے، عطا پر سکون سے اور مصیبت میں ناامید ہونے سے۔ پروردگارا! میری طرف سے وہ سب کچھ ہے جو میری ذلت و پستی کے مطابق ہے تو تیری طرف سے بھی وہ سب کچھ ہونا چاہئے جو تیرے کرم کے شایان شان ہے ۔

خدا یا! تونے اپنی تعریف لفظ لطیف ورؤوف سے کی ہے اور میرے ضعف کے وجود کے پہلے سے اسکا مظاہرہ کیا ہے تو کیا اب ضعف ظاہر ہو جانے کے بعد اسکو روک دے گا ؟

پروردگارا! اگر مجھ سے نیکیوں کا ظہور ہو تو وہ تیرے کرم ہی کا نتیجہ ہے اور اگر برائیاں ظاہر ہوں تو یہ میرے اعمال کا نتیجہ ہیں اور ان پر تیری حجت تمام ہے ۔ خدایا ! جب تو میرا کفیل ہے تو دوسرے کے حوالے کس طرح کریگا اور جب تو میرا مددگار ہے تو میں ذلت سے کس طرح دو چار ہوں گا ۔ تو میرے حال پر مہربان ہے تو مایوس اور ناکام ہونے کی کیا وجہ ہے!

اب میں اپنی فقیری ہی کو واسطہ قرار دیتا ہوں لیکن اسے کس طرح واسطہ قرار دوں جبکہ تیری بارگاہ تک پہنچنے کا سوال ہی نہیں ۔ میں اپنے حالات کاشکوکہ کس طرح کروں کہ تو خود ہی بہتر جانتا ہے ۔ اپنی زبان سے کس طرح ترجمانی کروں کہ سب کچھ تو تجھ پر خود ہی روشن و واضح ہے یا کیونکر تو میری امیدوں کو ناامیدی میں تبدیل کرسکتا ہے کیونکہ وہ تیرے ہی کرم کی بارگاہ میں پیش کی گئی ہیں اور کیسے حالات کی اصلاح نہیں کریگا جبکہ انکا قیام تیری ہی ذات سے وابستہ ہے ۔

خدا یا! میری عظیم ترین جہالت کے باوجود تو کس قدر مہربان ہے اور میرے بدترین اعمال کے باوجود تو کسی قدر رحیم و کریم ہے ۔ خدا یا! تو کس قدر مجھ سے قریب ہے اور میں کسی قدر تجھ سے دور ہوں اور جب تو اس قدر مہربان ہے تو اب کون درمیان میں حائل ہو سکتا ہے ۔

خدا یا! آثار کے اختلاف اور زمانے کے تغیرات سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ تو ہر چیز اور رنگ میں اپنے کو ظاہر و واضح کرنا چاہتا ہے کہ میں کسی بھی طرح جاہل نہ رہ جاؤں اور ہر حال میں تجھے پہچان سکوں ۔ خدا یا ! جب میری ذلت میری زبان کو بند کرنا چاہتی ہے تو تیرا کرم قوت گو یائی پیدا کر دیتا ہے اور جب میر

ے حالات و کیفیات مجھے مایوس بنا ناچاہتے ہیں تو تیرے احساسات پہر پر امید بنا دیتے ہیں ۔
خدا یا !میں، جسکی نیکیاں بھی بدی جیسی ہیں تو اسکی برائیوں کا کیا حال ہو گا اور جسکی نگاہ کے حقا
ئق بھی دعوے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے ہیں تو اسکی دعووں کی کیا حیثیت !
خدا یا !تیرے نافذ حکم اور تیری قہرمان مشیت نے کسی کے لئے بولنے کا موقع نہیں چھوڑا اور نہ کسی کو کسی
حال پہ ثابت رہنے دیا۔
خدایا !کتنی ہی بار میں نے اطاعت کی بنا رکھی اور حالات کو مضبوط بنایا لیکن تیرے عدل وانصاف نے میرے
اعتماد کو منہدم کر دیا اور فضل و کرم نے مجھے سہارا دیا۔
خدایا ! تجھے معلوم ہے کہ فعل وعمل کے اعتبار سے میری اطاعت دائمی نہیں ہے تو محبت اور عزم وجزم
کے اعتبار سے تو بہر حال دائمی ہے۔

- (1)۔ قد احيى عقله و امارت نفسه حتى دق جليله و لطف غليظه و برق له لامع كثير البرق، فابان له الطريق و
تدافعت الابواب الى باب السلامة و دار الإقامة و ثبتت رجلاء بطمانيئة بدنه في قرار الامن و الراحة: بما استعمل
قلبه و ارضى به۔(نهج البلاغة خطبہ/220)
- (2)۔ يا اباذر!۔۔۔ لا يؤنسك الا الحق و لا يوحشك الا الباطل۔(نهج البلاغة)